© rasailojaraid.com

یادِ رفتگاں: جناب ابرار خٹک*

پیرِ مشرق: سراج الاسلام سراجؔ

پیرِ مشرق کو پہلی بار اس وقت دیکھا تھا جب میں چوتھی یا پانچویں جماعت کا طالب علم تھا اور اپنے دادا، دادی کے ساتھ صحبت آباد، مردان جارہا تھا۔ بس موجودہ اکوڑہ پبلک سکول، اکوڑہ خٹک (چونگی سٹاپ) کے سامنے آکر رکی۔ سفید شلوار قمیص میں ملبوس، قراقلی ٹوپی پہنے، سفید ریش، فرشتہ صفت شخص کو دیکھا۔ ان کی شخصیت ایسی جاذب و دلکش تھی کہ فوراً اپنے حصار میں لیا اور چند لمحے ہی سہی، جب تک بس روانہ نہ ہوئی ٹکٹکی باندھ کر انہیں دیکھتا رہا۔ گاڑی روانہ ہوئی تب بھی میری نظریں مسلسل اُن پر جمی رہیں حتّٰی کہ کافی فاصلہ طے ہوا اور وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ اس پہلی نظر کا اثر ذہن و فکر، قلب و روح پر ایسے نقش ہوا کہ مٹائے نہ مٹا اور اب جب کہ پیرِ مشرق اس فانی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اس لمحے کا اثر تا حال، دل میں صرف محسوس ہی نہیں کرتا بلکہ ان کی شخصیت کے حصار کی بلند و بالا دیواروں میں اپنے آپ کو مستقل مقید بھی پاتا ہوں۔ دوسری بار ان کو گورنمنٹ ہائی سکول، اکوڑہ خٹک میں پرنسپل نثار احمد صدیقی اور دیگر اساتذہ کی معیت میں آتے دیکھا۔ وہی دلکش منظر، گھنی سفید داڑھی، کشادہ پیشانی، متوسط چہرہ، ہلکے آبرو، سیاہ چمکتی آنکھیں، سرخ رخسار، صاف مونچھ، متناسب اعضا، لمبا قد، سر پر قراقلی ٹوپی، کندھوں پر سفید رومال، سفید شلوار قمیص، باوقار چال، دور سے نظر پڑی تو وہی ٹھہر گئی اور پلکیں جھپکنے کا یارا ہی نہ رہا۔ آنکھیں اب کے بار سیراب ہوئیں کہ انہیں انتہائی قریب سے صباحی اسمبلی میں دیکھا۔ پرنسپل اور اساتذہ کی جانب سے سراپا احترام خود گواہی دے رہا تھا کہ یہ ہستی یقیناً درس و تدریس کی دنیا سے منسلک ہوگی۔ مشرقی وضع قطع، نورانی چہرہ، شگفتہ رُخسار، باوقار چال، صبر و استقامت کا مجسمہ؛ سراج صاحب جیسے ''پیرانِ مشرق'' کا خاصہ ہی ہوسکتا ہے کہ طاقت و مراتب کی دنیا ایسے روح پرور شخصی مناظر اور تسکین و اطمینان سے تہی دست ہوا کرتی ہے اور ہر کسی کو یہ رتبہ نصیب بھی نہیں ہوتا۔ پرنسپل صاحب نے امامِ فنِ تدریس، استاذ الاساتذہ، شاعر و ادیب، مترجم و خوش نویس اور نہ جانے اور کن کن خطابات و القابات سے ان کا تعارف کرایا، تاہم خیالات کے اظہار کی دعوت دی گئی تو نہ معلوم کیوں؟ انہوں نے معذرت کی اور یوں دوسری جھلک بھی محض نظارے تک محدود رہی اور سماعتیں بدستور محرومِ شیریں گفتار رہیں۔ تاہم خوشی رہی کہ دامنِ دیدہ و دل دیدار کے موتیوں سے لبریز ہوگیا تھا۔ کچھ عرصے بعد سکول میں نوماہی امتحان کے نتائج کا اعلان صباحی اسمبلی میں ہورہا تھا۔ جہانِ علم و عمل کے آفتاب و ماہتاب استاذی قاضی انوار الدین مرحوم

---

* استاد شعبۂ اُردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، نوشہرہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دمغفور کے ہاتھوں انعامات کی تقسیم ہورہی تھی۔ جماعتِ نہم میں امتیازی پوزیشن کے انعام کے لیے میرا نام پکارا گیا' تالیوں کی گونج میں قاضی صاحب موصوف کے ہاتھوں سے انعام کی وصولی کا منظر ذہن و دل پر نقش ہے' تاہم انعام کی صورت میں جو تحفہ ملا اس کی خوشی آج بھی تازہ ہے۔ انعام پیر مشرق کی کتاب ''دا خما کلے دے'' (''یہ میرا گاؤں ہے: اکوڑہ خٹک کی تاریخ' جغرافیہ' تہذیب وثقافت' علوم وفنون' کھیل' تاریخی مقامات' سیاست' پیشے' کارخانے غرض منظوم انسائیکلوپیڈیا ہے' جس میں اس تاریخی شہر کے جملہ شعبہ ہائے حیات کی منظوم منظر کشی دلکش انداز میں کی گئی ہے۔) گھر پہنچا تو نظم بار بار پڑھتا' سیری نہیں ہوتی تھی۔ خود مزے اٹھاتا رہا' سننے والوں کو محظوظ کرتا۔ طلسماتی شخصیت کی خاموشی نے نوخیز دل کو کب کا اسیر کردیا تھا' نظم کی سادگی' طرزِ ادا' بے ساختہ وولولہ انگیز اشعار نے روح کے جذبوں کو بھی ان کا گرویدہ بنادیا۔

میٹرک کا مرحلہ سر کرکے خوشحال خٹک کالج پہنچا تو ہر صبح یا دوسرے تیسرے دن پیر مشرق کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے ان کی طلسماتی شخصیت پر نظر پڑتی۔ وہی دلکش منظر' کھڑے ہوتے تو نظریں ان کا طواف کرتیں' روانہ ہوتے تو زمانہ ایک نظر دیکھنے کے لیے رک جاتا۔ کئی بار سلام دُعا کا موقع آیا' ان کی شفقت بھری نظریں پڑتیں اور یہاں میرا دل رہا کہ ان سے گفتگو کرنے کے لیے مچلنے لگتا۔ ہمیشہ اس طاق میں رہا کہ تفصیلی ملاقات کا موقع مل جائے؟ خوش قسمتی سے کالج کے ایک پروفیسر صاحب نے ان کے اسکول میں سہ پہر کے وقت ٹیوشن پڑھانے کا پروگرام بنایا۔ ایک دن اسکول کے باہر بینر آویزاں دیکھا تو فوراً ان کے دفتر میں داخل ہوا۔ سامنے کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے میز' بائیں طرف تین' چار کرسیاں' میز کے سامنے رستہ اور پھر بینچ' دائیں طرف گھر میں داخل ہونے والا دروازہ' سر کے اوپر دیوار کی پیشانی پر ان کے ہاتھوں خوش خط الفاظ میں حمزہ بابا کا پشتو اور ترجمہ شدہ اردو شعر لکھا ہوا تھا۔

ستر گی می لوستے شی د فطرت کتاب　　به وڑاند د اشنا چه شی امیانی شی

آنکھیں میری پڑھ سکتی ہیں فطرت کے صحیفے　　جب سامنے ''وہ آئیں'' تو ہو جاتی ہیں ان پڑھ

پیر مشرق کچھ لکھنے میں مشغول تھے' میں نے السلام علیکم سے ان کو مخاطب کیا اور وہاں تہذیبی سانچوں میں ڈھلی' سحر انگیز شخصیت نے میرا استقبال وعلیکم السلام سے کیا۔ ٹیوشن کی غرض نے آج میری مراد پوری کردی تھی۔ یہاں عرض مدعا بیان کی اور وہاں انہوں نے پے درپے سوالات کرکے پلک جھپکنے میں نہ صرف مجھے کریدا بلکہ داد وتحسین کی گھٹی بھی پلائی اور یوں میری کیفیت پشتو کے اس ٹپے کی مانند ہوتی رہی:

کہ　　فقیره دوه سُوده دِ وکڑل　　یو دِ خیر واخست' بل دِ وکڑل دیدنونه

''فقیر! تو نے دو فائدے حاصل کیے' وصلِ محبوب کے ساتھ ساتھ بھیک بھی!''

وہاں سوالات ہو رہے تھے اور یہاں میری نظریں تھیں کہ ان کے نورانی چہرے پر مسلسل جمی رہیں۔ ملاقات کی تشنگی سیراب ہی نہیں نہال ہو چکی تھی' ان کی صحبت سے یوں نکل رہا تھا جیسے صحرا کا پیاسا مرغزار کے شیریں چشموں سے سیراب ہو کر جا رہا ہو۔ یوں اس ملاقات کی بنیاد پر جو تعلق قائم ہوا وہ نشست و برخاست کی صورت میں اس وقت تک قائم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہا جب تک پیرِ مشرق نے ہاتفِ رحیل پر لبیک نہ کہا تھا۔ ان کے جانے سے یوں محسوس ہوا جیسے سایہ دار درخت کی گھنی چھاؤں سے محروم ہو گئے ہوں۔ شفقت کا یہ عالم تھا کہ پہلی بار جب ان پر فالج کا حملہ ہوا، جس نے ان کے حافظے اور قوتِ گویائی کو شدید نقصان پہنچایا تھا، اپنے بیٹے کی ہتھیلی پر میرا نام اپنی انگلیوں کی مدد سے لکھ کر بلاتے رہے۔ جس وقت ان کو لحد میں اتار رہے تھے رہ رہ کر وہ شعر یاد آ رہا تھا جسے خود پیرِ مشرق پڑھ کر اکثر آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے۔

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے   بھری محفل سے اُٹھوایا گیا ہوں

اس ملاقات کے بعد ہر دوسرے، تیسرے یا ہفتے میں ایک دو بار ان سے باقاعدہ ملاقات ہوتی۔ جب کبھی بوجوہ ناغہ آتا، وہ پیغام بھیجتے یا خود ہمارے گاؤں کی طرف چلے آتے۔ جہاں ان کی دختر نیک اختر کا گھر بھی ہے۔ جب بھی ان کے ہاں سے روانہ ہوتا کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور میرے ہاتھوں پوتے، پوتیوں کے لیے بھیجتے، اور مجھے پیرِ مشرق کی یہ ادا تہذیبی روایتوں کے ہزار افسانے سنا دیتی۔ سکول کا صدر دروازہ ان کا دفتر تھا جہاں وہ صبح و شام بیٹھے ہوتے، مہمان آتے، سلام دُعا کرتے، اداب کا چلن ہوتا، رستے پر چلنے والے سینے پر ہاتھ رکھ کر سلام کرتے۔ بعد از عصر حقانیہ اکوڑہ خٹک کے مختلف درجات کے طالب علم آ کر خوشنویسی کی مفت تعلیم و تربیت حاصل کرتے۔ پیرِ مشرق خاطر تواضع کرتے، علمی گفتگو ہوتی۔ زیرِ مطالعہ نیا نکتہ زیرِ بحث آتا۔ کبھی حجروں، درباروں میں نہیں جاتے تھے، مشاعروں میں بھی نہیں شرکت نہ کرتے۔ روایتی شاعری، شعرا سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ علما، فضلا اور ایسے ادبا جن کے ہاں مقصد پسندی ملتی، سے تعلق رکھتے اور ان کی انتہائی قدر کرتے تھے۔ سرکاری و نجی اداروں کے اساتذہ آ کر ان سے تدریسی رموز پر گفتگو کرتے۔ کلاس روم سے شاگردوں کو بلا کر ریاضی، انگریزی، اردو کے بنیادی سوالات پوچھتے اور جو کوئی وہاں بیٹھا ہوتا ان کو پیرِ مشرق کے علمی و تدریسی ذوق و شوق کا معترف ہو کر نکلنا پڑتا۔

میری ملاقات ان سے ایسے وقت میں ہوئی جو ان کی زندگی کے آخری ۱۲، ۱۳ سال تھے۔ انتہائی حلیم اور بردبار، مصافحہ و معانقہ کرتے تو دیر تک کمر پر تھپکیاں دیتے، ہاتھ ملاتے ہوئے کئی بار جھٹکے دیتے، ان کے اس مصافحے و معانقے میں بھی محبتیں ایسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتیں کہ ملنے والا اخلاص و مروت کے خزانوں سے مالا مال ہو جاتا۔ رستے پر جاتے تو آپ کے وضع قطع سے ہر کوئی متاثر ہو جاتا۔ پشاوری چپل کا استعمال زیادہ کرتے۔ ان کا مطالعہ، علمی و ادبی ذوق اس معیار کا تھا کہ بیٹھے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا اور ملاقاتیں نشستوں میں بدل جاتیں۔ لحہ لحہ ان کی گفتگو علمیت کے انوکھے رنگ جھلکنے لگتے۔ ان کی محفلوں ہی کا اثر تھا کہ زبان کو بولنے اور قلم کو لکھنے کا سلیقہ آیا۔ اکثر اوقات ان کے رفقا، ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ نشستوں میں موجود رہتا۔ ان کی پر تاثیر گفتگو، مشاہدات و تجربات کا اظہار، علمی، فکری، فنی اور نادر ادبی نکات کی تفہیم سے اہلِ محفل حیران رہ جاتے۔ کلاسک شعرا کے فکر و فن کے باریک نکات بیان کرتے تو ذوقِ ادب کو مزید تحریک ملتی۔ سامع و ناظر کو محسوس تہذیبی و تمدنی کیفیت میں ڈھال لیتے، ماضی کا ایک ایک ورق الٹتا، یوں محسوس ہوتا گویا وقت کا پہیہ یکسر مخالف سمت چلنے لگا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی زدہ ماحول کے بالکل الٹ، ماضی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے دور اپنے کے دوش پر کسی مکتب و مدرسے کی گمنام گلی میں داخل ہو کر بند در کھول لیتے' درسی محفلوں' مکتب و مدرسے' مسجد 'رہٹ' میدانوں' ڈھلتی شاموں اور سلگتی راتوں کے حوالے سے درویشانِ خدامست' صاحبانِ علم و دانش کی حکایات بیان کرتے' تدریسی زندگی کے منفرد و انوکھے واقعات زبان پر انگڑائی لیتے تو سننے والے پر سکتے کا عالم طاری ہو جاتا۔

پیر مشرق کی نشستوں میں رومی و سعدیؒ قاآنی وجامی و دیگر اساتذہ فارسی کی باریکیاں منکشف ہوتیں' رحمانؒ' خوشحالؒ و اقبالؒ کے فکر و فن کی پرتیں کھلتیں' بیدل و غالب کی نکتہ آفرینیاں آشکار ہوتیں' قصیدہ بردہ شریف کا منظوم پشتو فرہنگ و آہنگ جسم و روح پر وجد طاری کر دیتا' غالب کا گنجینۂ معانی پشتو سے غازہ و رخسار سجا کر ایک ہی نظر میں لوٹ لیتا' خوشحال خٹک' حمزہ و علی خانؒ کا ہمہ رنگ و جہت تخیل' لباسِ اردو میں دل و جگر چیر لیتے: اور ار بونہ سلاموںہ (منظوم نعتیہ اشعار) اسماء الحسنٰی' منظوم احادیث سے وجد کا سماں بندھ جاتا۔

بقول مولانا ابراہیم فانیؒ علم الاعداد اور علمِ تقویم کے حوالے سے آپ کو امامِ عصر کا مقام و رتبہ حاصل تھا۔ مادہ ہائے تاریخ نکالنا' ۲۸ سالہ کیلنڈر مرتب کرنے میں آپ کو ملکہ حاصل تھا۔ علمِ ریاضی (بشمول اردو' انگریزی) کے باریک نکات کو آسان' منظوم انداز میں نو آموز طلب و طالبات کے لیے پیش کرتے تو ابتدائی درجات ہی میں ان کے جوہر کھلنے لگتے۔ تاریخی حکایات' اساتذہ کی مشہور غزلوں پر تضمینیں لکھ کر بچوں کی تدریس کو سہل بنانے میں آپ کے تجربات آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ تدریس کے دقیق مسائل کے حل میں وہ آج بھی حیرت انگیز نتائج کے حامل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

بہادر شاہ ظفر کی مشہور غزل:

"کہوں کیا رنگ ہے اس کا' آہا ہا ہا' اُہو ہو ہو ہوا رنگِ چمن سارا' آہا ہا ہا' اُہو ہو ہو"

کو اکوڑہ خٹک کے مقامی بچوں کے لیے کتنے دلچسپ' آسان و دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ ابتدائی تدریس کے تمام فلسفے اس نظم میں بدرجہ اتم سموئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نظم کا عنوان "میرا گھر" رکھا ہے' ملاحظہ ہو:

جو پوچھا تم نے گھر میرا' آہا ہا ہا' اُہو ہو ہو ہے میرا گھر چمن سارا' آہا ہا ہا' اُہو ہو ہو
میں جس گاؤں میں رہتا ہوں' اکوڑہ نام ہے اس کا یہاں بہتا ہے اک دریا' آہا ہا ہا' اُہو ہو ہو
اسی دریا کا پانی دور کابل کے پہاڑوں سے مزے لے لے کے ہے آتا' آہا ہا ہا' اُہو ہو ہو
اکوڑ خان نامی شخص' اس بستی کا بانی تھا "سرائے" نام تھا پہلا' آہا ہا ہا' اُہو ہو ہو
یہاں پر قافلے ہر ملک کے آ کر ٹھہرتے تھے لگا رہتا یہاں میلا' آہا ہا ہا' اُہو ہو ہو
یہاں قومِ خٹک کا اک بڑا سردار گزرا ہے وہ تھا ہر علم میں یکتا' آہا ہا ہا' اُہو ہو ہو
اُسے خوشحال خان کے نام سے لوگ پہچانے پٹھانوں کا بڑا بابا' آہا ہا ہا' اُہو ہو ہو
وہ شاعر تھا' بہادر تھا' نڈر جرنیل تھا قابل نہ اس جیسا کوئی گزرا' آہا ہا ہا' اُہو ہو ہو
مسلمانوں کی ہر تحریک کو قوت ملی یاں سے ہے یہ دعویٰ مرا سچا' آہا ہا ہا' اُہو ہو ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں گھر گھر ہے روشن علم کے موتی بکھرتے ہیں — فضا ساری ہے روح افزا' آہا ہا ہا' اُہو ہو ہو

یہ قصبہ علم و حکمت کا 'سیاست کا ہے گہوارہ — یہ مجھ کو دل سے ہے پیارا' آہا ہا ہا' اُہو ہو ہو

ابھی ہوں علم کا طالب 'بنوں گا قوم کا خادم — سراج استاد ہے میرا' آہا ہا ہا' اُہو ہو ہو

اس سلسلے میں ان کی پشتو منظومات "کیمسٹری کے آٹھ گیس"، "ضلع پشاور کا جغرافیہ" "جیومیٹری" وغیرہ کے ذریعے بھی انتہائی حیرت انگیز نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ بچوں کی دلچسپی کو ملحوظ خاطر رکھ کر تدریسی معاونات تیار کرتے اور یوں مشکل نکات کو انتہائی آسان انداز میں طلبہ و طالبات کے ذہن نشین کر لیتے۔ میرا علمی و ادبی ذوق متحرک تھا اور ان کے مطالعات و تجربات سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش میں ہر وقت لگا رہتا۔ "الحق" رسالے کی پروف ریڈنگ کرتے، نوک پلک سنوارتے اور دلچسپ علمی نکات میں شریک کرتے، ان کی محفل سے اُٹھنے کو جی نہ چاہتا، جب بھی رخصت ہوتے، یوں محسوس ہوتا جیسے مشک و عنبر زر و جواہرات کے ذخیرے چھوڑ کا جارہے ہوں۔ ہر مرتبہ تخلیق و تدریس، تحریر و تقریر کے انوکھے رنگ اپنے ساتھ لے کر چلا جاتا۔ غالبؔ و حمزہؔ، خوشحال خٹکؔ و علی خانؔ کی غزلوں کے اردو، پشتو تراجم فنِ ترجمہ کے اصول و ضوابط ہی پر پورا نہیں اترتے بلکہ انتہائی اعلیٰ معیار کے عالمی ادبی تراجم میں جگہ پاسکتے ہیں، جن کی نظیر پشتو سے اردو اور اردو سے پشتو تراجم کی روایت میں بھی اس شان سے نہیں ملتی۔ وفیات پر مرثیے، شادی بیاہ پر سہرے لکھنے میں بھی آپ کو انتہائی شہرت حاصل تھی۔ بیٹیوں کی رخصتی پر آپ نے جو سہرے لکھے ان کی ادبی شان مسلّمہ ہے۔ ماں باپ کے جذبات کی ایسی فطری عکاسی کی ہے کہ احسان دانش کی مشہور نظم "مزدور کی بیٹی" کی یاد ہی تازہ نہیں ہوتی بلکہ مزید انفرادیت اختیار کر لیتی ہے اور تمام والدین کے دل کی آواز بن جاتی ہے۔

ان کی معیت میں اکثر اوقات مختلف علاقوں میں جانے اور ان کے دوستوں، شاگردوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، جہاں پہنچتے، شاگردوں کی نظر پڑتے ہی آپ کو گھیر لیتے۔ وہ پیرِ مشرق کے شخصی و تدریسی قصے بیان کرتے اور مجھے ان کے ماضی پر رشک آنے لگتا۔ ایسی عزت، احترام اور عقیدت ہم نے بہت کم اساتذہ کی دیکھی۔ ایک دفعہ کہنے لگے "میرا تبادلہ بدرشی سے زیارت کا کا صاحب ہوا۔ رخصت ہو رہا تھا تو سارے اساتذہ انتہائی دکھی تھے، معانقہ کر رہا تھا تو سارے آبدیدہ ہوئے، چونکہ طویل عرصہ گزارا تھا اس لیے میں بھی رو رہا تھا، ایک بچے نے مجھے روتے دیکھا تو پاس آیا اور میری مٹھی میں ایک آنہ رکھا۔ اس بچے کا خیال تھا کہ گویا میں بھی ان کی طرح، (جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے، رو کر والدین سے پیسوں کا تقاضا کرتے ہیں) پیسوں کے لیے رو رہا تھا۔ یہ منظر آج بھی یاد آتا ہے تو زیرِ تبسم آنسو آجاتے ہیں۔"

ایک ہی شعبے سے وابستہ انسانوں میں باہمی رقابتیں اکثر نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف منفی تاثرات سننے کو ملتے ہیں تاہم پیرِ مشرق کے متعلق ایسی آرا کبھی سننے کو نہیں ملیں جس سے ان کے مضبوط کردار کی غمازی ہوتی ہے۔ بعد از عصر اکثر طالبانِ حقانیہ یا سکول کے دو تین لڑکے ٹیوشن کے لیے بیٹھے ہوتے۔ کوئی شخص آکر گھر کا دکھڑا سناتا، ان کے پاس لوگ عموماً گھریلو مسائل لے کر آتے، جسے پیرِ مشرق حکمت و تدبر سے حل کر لیتے۔ (بقیہ صفحہ ۴۶ پر)

© rasailojaraid.com